تبصرۂ کتب

ارمغانِ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مرتبین: پروفیسر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر عزیز ابن الحسن، ناشر: شعبۂ اردو، پنجاب یونی ورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور، ۲۰۰۹ء، صفحات: ۳۱۲، قیمت ۔/۳۰۰ روپے (مجلد)۔

شعبۂ اردو، پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج، لاہور نے اپنے سابقہ اساتذہ کی خدمات کے اعتراف میں ارمغان پیش کرنے کا سلسلہ ۲۰۰۲ء سے جاری کر رکھا ہے۔ اگرچہ یہ سلسلہ بہت دیر سے شروع ہوا اور اس کے درمیانی وقفے بھی نسبتاً طویل رہے ہیں، لیکن اس قابلِ قدر روایت کا تسلسل خوش آئند ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کے بقول: ''زندہ معاشرے اور بیدار مغز افراد اپنے بچھڑنے والوں کو ہمیشہ یاد کرتے اور ان کی چھوڑی ہوئی روشنی سے اپنے دِیے جلانے کا اہتمام کرتے رہتے ہیں'' (ص۲۷)؛ چنانچہ ارمغانِ شیرانی [حافظ محمود شیرانی] (فروری ۲۰۰۲ء) اور ارمغانِ ڈاکٹر سید عبداللہ (اکتوبر ۲۰۰۵ء) کے بعد شعبۂ اردو نے اسی تسلسل میں ارمغانِ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی پیش کی ہے۔ اور یہ بات مزید اطمینان کا باعث ہے کہ مستقبل میں ارمغانِ سید وقار عظیم، ارمغانِ ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ارمغانِ سجاد باقر رضوی کا وعدہ بھی دہرایا گیا ہے۔

ارمغان کے پہلے حصے میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر سیف اللہ خالد اور سلمیٰ صدیقی کے ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کے بارے میں مضامین شامل ہیں، جب کہ اسی حصے کے آخر میں صدیقی صاحب کی غیر مطبوعہ آپ بیتی کے منتخب حصے پیش کیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے ستمبر ۱۹۶۰ء سے ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کی رحلت تک ان سے اپنے تعلقات اور یادداشتوں کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے، جب کہ مضمون کے دوسرے حصے میں ان کے علمی کارناموں کا تعارف پیش کیا ہے۔ خواجہ صاحب نے محض تصانیف و تالیفات کا تعارف ہی نہیں کرایا، بلکہ ان پر بڑی دیانت داری سے تنقیدی نگاہ بھی ڈالی ہے۔

'بیادِ افتخار احمد صدیقی' اپنے مندرجات اور اندازِ بیان کے اعتبار سے پُراثر مضمون ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنے اس مضمون کا آغاز و اختتام موت کی سنگینی اور اس کے اثرات کے حوالے سے اچھوتے انداز

میں کیا ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کی تحقیق، تدوین، ترتیب، تراجم اور شاعری کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی کے بعض اہم واقعات نہایت اختصار، لیکن جامعیت سے بیان کیے ہیں۔ صدیقی صاحب کے حافظے کے انحطاط سے رونما ہونے والی صورتِ حال کو صاحبِ مضمون نے بڑی دل گرفتگی سے قلم بند کیا ہے، بلاشبہ حقیقی جذبات نگاری اور مؤثر اندازِ بیان کے اعتبار سے یہ مضمون چیزے دِگر ہے۔

''افتخار احمد صدیقی: بے لوث معلم' بے بدل محقق'' میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے اپنے زمانۂ طالب علمی سے وابستہ اپنی یادوں کے حوالے سے بطور معلم اور بطور ممتحن، صدیقی صاحب کی شخصیت کے بعض پہلوؤں سے پردہ اٹھایا ہے، ان کے خطوط کی مدد سے ان کی علمی وادبی صلاحیتوں کے عدم اعتراف سے رونما ہونے والے المیے کا ذکر کیا ہے۔ جزئیات نگاری، استخراجِ نتائج اور دل چسپی کے اعتبار سے یہ ایک عمدہ اور پُر اثر تحریر ہے۔ مضمون کے آخر میں صدیقی صاحب کے گیارہ خطوط (مع حواشی وتعلیقات) پیش کیے گئے ہیں، جن سے صدیقی صاحب کے کئی منصوبوں، خواہشات، رویوں اور اسلوبِ حیات کا اندازہ ہوتا ہے۔

پروفیسر سیف اللہ خالد نے اپنے مضمون میں ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کے ان ایام کو یاد کیا ہے، جو انھوں نے اسلامیہ کالج، لاہور میں گزارے تھے۔ صدیقی صاحب کی غیر مطبوعہ خودنوشت نقشِ دوام کے اقتباسات پر مشتمل یہ مضمون بہت سی تلخ وشیریں یادوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔

بقول مرتب، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کی خودنوشت تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہے، جس میں آبا واجداد، بچپن، لڑکپن، تعلیمی مراحل، ہجرت، ملازمت، اسلامیہ کالج، یونی ورسٹی اورینٹل کالج اور اسلامیہ یونی ورسٹی کے حوالے سے صدیقی صاحب نے اپنے تفصیلی حالات اور مشاہدات وتجربات قلم بند کیے ہیں۔ مرتب نے اس کے کچھ منتخب حصے پیش کیے ہیں، جن سے قارئین کو مرحوم کے مراحلِ حیات اور افتادِ طبع اور مقاصدِ حیات کی تکمیل کے لیے ان کی جدوجہد کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔ (ص۹۶-۹۷)

بائیس صفحات پر پھیلے ہوئے یہ اقتباسات اس لحاظ سے بہت اہم ہیں کہ مرتب نے اس بات کی کامیاب کوشش کی ہے کہ قاری ان منتخبات کے مطالعے کے نتیجے میں صدیقی صاحب کے تمام حالات سے نہ سہی، تمام مراحلِ حیات سے ضرور شناسا ہو جائے۔

'روشنی کا سفر' میں سلمیٰ صدیقی نے جس کرب اور خلوص سے اپنے والد گرامی کو یاد کیا ہے، وہ اندازِ تحریر بجائے خود تڑپا دینے والا ہے۔ سلمیٰ نے بجا طور پر ایک بیٹی کے جذبات کی عکاسی کی ہے اور حقیقی معنوں میں اپنے والد کی یاد آوری کا حق ادا کر دیا ہے۔ انھیں بات کہنے کا سلیقہ بھی آتا ہے اور گفتگو کو پُر تاثیر بنانے کا ہنر بھی۔ والد کی ابتر ہوتی ہوئی ذہنی حالت کے پس منظر میں ایک بیٹی کی نفسیاتی کیفیات اور ذہنی کرب کا اس سے بہتر بیان شاید ہی ممکن ہو۔

ارمغان کا دوسرا حصہ صدیقی صاحب کے پسندیدہ موضوعات، بلند پایہ اور معیاری مضامین پر مشتمل ہے۔ مضمون نگاروں میں ایک طرف ہماری تحقیقی روایت کے امین دکھائی دیتے ہیں تو دوسری جانب تازہ واردانِ تحقیق اپنی کاوشوں کے ساتھ موجود ہیں۔ ڈاکٹر حنیف نقوی، پروفیسر عبدالحق اور ڈاکٹر عارف نوشاہی کے مضامین خالص تحقیقی نوعیت کے ہیں۔ یہ مضامین اپنے مندرجات اور نتائج کے اعتبار سے خاصے کی چیز ہیں۔

ڈاکٹر حنیف نقوی نے ’غالب سے منسوب تین جعلی تحریریں‘ کے نام سے اپنے مضمون میں صفدر مرزا پوری کے دریافت کردہ غالب کے دو خطوط (بنام: مولانا احمد حسین مینا مرزا پوری) اور پتنگ کے موضوع پر غالب کی قدیم ترین نظم کو قوی دلائل کے ساتھ جعلی قرار دیا ہے۔ محقق کے نزدیک تحقیق کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اگر کوئی راوی صریحاً غلط بیانی یا جعل سازی کا مرتکب پایا جائے تو اس کی کوئی روایت قبول نہیں کی جا سکتی۔ صفدر مرزا پوری، غالب کے دو خطوط وضع کر کے اپنی ثقاہت کا بھرم کھو چکے ہیں...... یہاں یہ وضاحت بھی بے محل نہ ہوگی کہ صفدر مرزا پوری لکھنؤ میں وصل بلگرامی کی قیام گاہ کی اس محفل کے مستقل شرکاء میں شامل تھے، جس میں آسی صاحب احباب کی فرمائش پر اکثر ’غالب کا غیر مطبوعہ کلام‘ پیش کرتے رہتے تھے۔ (ص۱۳۲۔ ۱۳۳) ڈاکٹر حنیف نقوی کی اس تحقیق کو غالبیات میں بلا تامّل ایک اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

’’تذکرۂ الٰہی کا نایاب اور واحد خطی نسخہ‘‘ میں پروفیسر عبدالحق نے میر الٰہی ہمدانی کے حالاتِ زندگی، معاصرین و اکابرین کی آراء، تذکرۂ الٰہی کا تعارف اور دیگر نسخوں سے اس کا تقابل پیش کیا ہے۔ ان کے خیال میں: ’’فردِ واحد کی فن کاروں کی جامع فہرست سازی، معلومات کی فراہمی، تخلیقات کا استناد کے ساتھ انتخاب اور انتقاد، ہمت اور حوصلے کی دلیل ہے‘‘۔ محقق کا یہ کہنا بجا ہے کہ میر الٰہی ہمدانی جیسے ادبی تاریخ کے گنجینۂ گہر شاعری میں کم سہی، مگر ادبی تاریخ کے مؤرخوں اور محافظوں کی صف میں ممتاز اور محترم مقام کے مالک ہیں۔ ان کی رائے میں: ’’اگر فردوسی و انوری و سعدی تخلیق کی تثلیث ہیں تو عوفی و اوحدی اور میر الٰہی تاریخ و تنقید کے سہ تن پیمبر انند کیوں نہیں؟‘‘ (ص۱۴۲)

ڈاکٹر عارف نوشاہی نے اپنے مضمون ’ثواقب المناقب اولیاء اللہ‘ میں مولانا روم اور ان کے خاندان اور وابستگان پر ایک جامع ترین ماخذ، یعنی شمس الدین احمد افلاکی عارفی (م: ۷۶۱ھ) کی قابلِ قدر تالیف: مناقب العارفین کی ایک اہم تلخیص ثواقب المناقب اولیاء اللّٰہ (از عبدالوہاب بن جلال الدین محمد ہمدانی) کا تعارف پیش کیا ہے۔ فاضل محقق نے دنیا کے مختلف کتب خانوں میں اس تلخیص کے تین غیر مطبوعہ قلمی نسخوں کی نشاندہی بھی کی ہے، جن کی بنیاد پر انھوں نے ایک مستند نسخہ مرتب کر کے شائع کرنے کا عندیہ دیا ہے۔

اقبالیاتی حوالے سے غلام رسول ملک، ڈاکٹر بصیرہ عنبرین، ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد اور ڈاکٹر خالد ندیم کی تحریریں شامل ہیں۔

پروفیسر غلام رسول ملک کے تحقیقی و تجزیاتی مضمون کو اگر ارمغان کی تابندہ تر تحریر قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ انھوں نے چھے صفحات کو محیط اپنے مختصر مضمون میں اردو کی نعتیہ شاعری کے مرکزی خیال کو گرفت میں لیتے ہوئے اقبالؒ کے ادراک و تخیل اور قلب و رُوح میں جاگزیں مقامِ مصطفویؐ کی نشان دہی کی کوشش کی ہے۔ ان کے خیال میں ’’اقبال کی نعتیہ شاعری (بلکہ حق یہ ہے کہ ان کی تمام شاعری) میں مقامِ محمدیؐ کا یہ عرفان وسیع تر، جمیل تر اور مؤثر تر انداز میں سامنے آیا ہے۔ انھوں نے مقامِ محمدیؐ کی جامعیت اور اُن کے انقلابی کارنامے کے مختلف ابعاد کا احاطہ کیا ہے اور پھر دیوانہ وار اپنی عقیدت مندیاں اس پر نچھاور کی ہیں‘‘۔ (ص ۱۵۷)

ڈاکٹر بصیرہ عنبرین کا شمار اگرچہ نو واردانِ اقبالیات میں ہوتا ہے، لیکن ان کی تحریروں میں علمی متانت، تحقیقی سنجیدگی اور اسلوبیاتی شگفتگی سے ان کے درخشندہ ادبی مستقبل کی نشان دہی ہوتی ہے۔ ’علامہ اقبال کا علامتی اسلوب‘ میں انھوں نے کلامِ اقبال کے علامتی نظام کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ شاہین، لالہ، پروانہ، جگنو، نَے، خونِ جگر، ساقی، آہو اور فقر جیسی علامات اور ان کے تلازمات اور اسی طرح بطور تلمیح معاشرتی، سیاسی، جغرافیائی، تہذیبی، علمی اور مذہبی شخصیات اور ان کے علامتی اظہار پر سیر حاصل گفتگو کے بعد انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اسلامی ثقافت و تہذیب کے باطن میں جھانکنے میں یہ علامتیں معاون ٹھہرتی ہیں۔ تلمیحی کردار بڑی سہولت کے ساتھ علامتی کرداروں میں مبدل ہو گئے ہیں۔ ان مرکزی علامتوں کی موجودگی نے کلامِ اقبال میں فکری عناصر پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اسے فنی اعتبار سے بھی حسن و عذوبت کا مرقع بنا دیا ہے۔ مزید برآں ’’اقبال کے علامتی اشعار میں تشبیہ، استعارہ، تجسیم، تمثیل اور تمثال جیسے دل کش عناصر کی آمیزش نے عجیب و غریب رنگ دِکھائے ہیں اور ان کی وساطت سے علامہ کے مواقف زیادہ نکھر کر سامنے آئے ہیں۔ یوں ایک بڑی سطح پر دیکھیں تو اقبال کی شاعری خود ایک علامت بن گئی ہے —— تحریک، تیقّن اور انقلاب کی علامت!‘‘ (ص ۱۹۶-۱۹۷)

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد اردو غزل کا تکنیکی، ہیئتی اور عروضی سفر کے توسط سے اپنی علمی صلاحیتوں کا اظہار کر چکے ہیں۔ ’’اقبال کا ایک شاگرد اور مقلد: اسلم‘‘ میں ناشاد اپنے دائرۂ تحقیق کی وسعتوں کا احساس دلانے میں کامیاب رہے ہیں۔ زیرِ نظر مضمون میں انھوں نے محمد اسلم خان کا تعارف کرایا ہے، جو غالباً اقبال سے اصلاح لیتے رہے۔ بقول محقق: ’’اسلم محض فکرِ اقبال کے خوشہ چیں اور مقلد نہیں، بلکہ لفظیات، اسالیبِ بیان، تکنیک، ہیئت اور فن کے دیگر آرائشی عناصر کے استعمال میں بھی وہ اقبال کی پیروی کرتے دِکھائی دیتے ہیں‘‘۔ (ص ۲۶۶) چنانچہ اسلم کے ہاں موضوعات و عناوین کے ساتھ ساتھ اس کے مجموعۂ کلام کے نام (نغمۂ جاوید) میں بھی فیضانِ اقبال کی جلوہ گری محسوس کی جا سکتی ہے۔ اگرچہ اس قسم کی تقلیدی روِش کو اقبال کے پیغامِ خودی سے متصادم قرار دیا جا سکتا ہے، اسی لیے علم و ادب کی دنیا میں ایسی

روش تحسینی کلمات کی مستحق نہیں ٹھہرتی، تاہم محقق کی جستجو کی داد دینی چاہیے، جنھوں نے سکندر خاں کی کتاب دامنِ اباسین میں موجود ایک سرسری ذکر کو اپنے لیے مشعل راہ بنایا اور اقبال کے ایک شاگرد اور مقلد کے کوائف جمع کر دیے۔

'آلِ احمد سرور کے چند اقبالیاتی خطوط' میں راقم نے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے نام سرور کے چار ایسے خطوط مرتب کیے ہیں، جن میں اقبالیاتی حوالے سے بعض اہم امور زیرِ بحث آئے ہیں۔ خطوط سے پہلے مکتوب نگار کا تعارف، اقبال سے وابستگی، مکتوب الیہ سے تعلقات کی نوعیت اور خطوط کی بعض خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ خطوط کی بہتر تفہیم کے لیے حواشی و تعلیقات کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔

پروفیسر ابوالکلام قاسمی اور ڈاکٹر عزیز ابن الحسن کے مضامین سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک شاعر ہی نہیں نقاد کے طور پر بھی، حالی کس قدر اہم اور توجہ کے قابل ہیں۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی اپنی تحقیقی ژرف نگاہی اور تنقیدی اُپج کے حوالے سے اردو زبان و ادب میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ 'الطاف حسین حالی اور غزل کی تنقید' میں انھوں نے غزل سے متعلق حالی کے نظریات کے پس منظر میں غزل کے عصری مباحث کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ غزل پر کیے گئے حالی کے اعتراضات اور سادگی، اصلیت، جوش اور لفظ پرستی جیسے تصورات کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد قاسمی صاحب کہتے ہیں:

> بیسویں صدی میں غزل کے اسالیب میں جو تنوع پیدا ہوا، اسے تنقیدی طور پر شعری اظہار کے نئے مباحث اور مغربی تنقید میں رائج ہونے والی صناعی، پیکر تراشی، پیراڈوکس، تناؤ، طنزیہ تہ داری وغیرہ سے سہارا ملا اور بدلی ہوئی شعریات میں اس نوع کی جدید غزل بہت سے نئے مباحث کا پیش خیمہ بن گئی۔ ان مباحث میں زبان کے استعمال کی نوعیت غزل کی صنف کے لیے اس باعث زیادہ اہمیت اختیار کر گئی کہ جس رویّے کو حالی نے لفظ پرستی کہا تھا، وہ شعری تنقید کا نیا حوالہ بن کر سامنے آئی۔ (ص۱۵۴)

'مقدمۂ شعر و شاعری: ایک تجزیاتی مطالعہ' میں ڈاکٹر عزیز ابن الحسن نے مولانا حالی کے تنقیدی افکار و خیالات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور مقدمے کے اکثر مباحث کا مفصل تجزیہ کیا ہے۔ مقدمے کے مندرجات پر تحقیقی و تنقیدی حوالے سے یہ ایک قابلِ قدر تحریر ہے، جو علمی اعتبار سے بھی مفید ہے اور تدریسی اعتبار سے بھی۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر اردو ادب کے استاد اور ذمہ دار نقاد ہیں۔ ان کی تحریریں ہمارے جدید اردو تنقیدی رویوں پر ان کی گہری نگاہ کی غماز ہیں۔ 'وسطی جدید اردو تنقید: مغربی تناظر میں' کے تحت انھوں نے بیسویں صدی کے پہلے چار عشروں میں اردو تنقید پر مغربی اثرات کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ استعماری تہذیبی غلبے کے نتیجے میں نوآبادیات کی فکری انفعالیت، یورپ سے درآمدہ تنقیدی نظریات کی بلاحیل و حجت قبولیت اور ان

کے زیرِ اثر وجود میں آنے والی نشاۃ ثانیہ کی بعض تحاریک کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ مضمون اپنے نظری افکار اور علمی متانت کے پیشِ نظر ارمغان کی قابلِ قدر تحریر قرار دیا جا سکتا ہے۔

کتاب کے آخر میں قاسم محمود احمد نے مضمون نگاروں کا مختصر تعارف مرتب کر کے قارئین کے ذوقِ مطالعہ کو تحریک دینے کا سامان کر دیا ہے۔ ان کی یہ کاوش قاری اور مضمون نگار کو زیادہ قریب لانے کا باعث بنے گی۔

اس ارمغان کو مرتب کرنے میں مرتبین نے جس مستعدی اور جاں فشانی سے کام لیا ہے، وہ بجائے خود داد کے قابل ہے۔ یہ ارمغان اپنے مندرجات اور طباعت، ہر دو اعتبار سے ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کے شایانِ شان قرار دیا جا سکتا ہے اور اس ضمن میں فاضل مرتبین کے ساتھ ساتھ صدرِ شعبۂ اردو کو بھی مبارک باد دی جانی چاہیے، کہ انھوں نے کم وقت اور محدود وسائل کے باوجود صاحبِ ارمغان سے اپنی محبت اور احترام کا عملی اظہار کیا ہے۔ اس سلسلۂ ارمغان سے جامعہ پنجاب نے دیگر جامعات کے لیے ایک قابل تقلید اور روشن مثال بھی قائم کی ہے۔

——ڈاکٹر خالد ندیم

* * *

کتاب الاسفار عن نتائج الاسفار، مصنفہ، شیخ اکبر محی الدین محمد ابن عربیؒ۔ اردو ترجمہ: روحانی اسفار اور ان کے ثمرات، از ابرار احمد شاہی۔ ناشر: ابن عربی فاونڈیشن راولپنڈی، صفحات ۲۵۰، قیمت: (پاکستان) -/۴۴۰، (بیرون ملک) -/۲۵/امریکی ڈالر۔

عربی متن کے ساتھ شائع ہونے والی یہ کتاب شیخ اکبر کا ایک رسالہ ہے۔ عربی متن کی تحقیق ڈینس گرل (فرنچ) اور فاضل مترجم نے کی ہے۔ شیخ اکبرؒ کے مطالب و معانی کا ترجمہ یا ترجمانی خاصا مشکل کام ہے، اس کی وجہ فقط ایک زبان سے دوسری زبان میں ان کو منتقل کرنے کی دقت نہیں ہے بلکہ شیخ اکبرؒ کا اپنا ایک مخصوص اندازِ نگارش ہے، جس میں متن انتہائی آسان عربی میں ہوتا ہے مگر معانی و مطالب انتہائی دقیق پرتوں میں ملفوف ہوتے ہیں۔ شیخؒ کے انداز بیان نے بڑے بڑوں کو فکر و نظر کی مشکلات میں مبتلا کیے رکھا ہے۔ زیرِ نظر رسالے سے شیخ اکبرؒ کا پورا نظامِ ادراک واضح ہو جاتا ہے۔ رسالے میں درج آخری سفر ''سفر الحذر'' میں وہ لکھتے ہیں:

> لایعرف ابداً الّا بالعجز عن معرفتہٖ۔ و ذلك ان نقول : لیس کذا و لیس کذا مع کوننا نثبت له ما اثبته لنفسهٖ ایماناً لا من جهة عقولنا و لا نظرنا، فلیس لعقولنا الا القبول منه فیما یرجع الیه، فهو الحی ﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَج اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ

الْمُتَكَبِّرُ﴾، ﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِج هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ﴾، ﴿الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ﴾ ﴿الْحَكِيْمُ﴾ [الحشر، ٣٩: ٢٢۔ ٢٤]، بهذا وامثاله اخبرنا عن نفسه فنؤمن بذلك كله على علمه بذلك لا على تأويل منا لذلك؛ فانه ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌج وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾[الشوریٰ، ٤٢: ١١]، فلا ينضبط لعقل ولا لنظر فيما لنا من العلم به من طريق الاثبات الا ما اوصله الينا فى كتبه وعلى السنة رسله المترجمين عنه ليس غير ذلك۔ ونسبة هذه الاسماء اليه غير معلومة عندنا؛ فان المعرفة بالنسبة الى امر ما موقوفة على علم المنسوب اليه وعلمنا بالمنسوب اليه ليس بحاصل، فعلمنا بهذه النسبة الخاصة ليس بحاصل، فالفكر والتفكر والمتفكر يضرب فى حديد بارد۔ جعلنا اللّٰه واياكم ممن عقل ووقف عند ما وصل اليه منه– سبحانه – ونقل۔ (ص١٩٨)

وہ ہمیشہ اپنی معرفت کے عدم سے پہچانا جاتا ہے۔ یہ ہمارا یوں کہنا ہے: وہ ایسا نہیں، وہ ایسا نہیں، لیکن ہم اس (ذات) کے لیے ایمان سے- نہ کہ اپنی عقل اور فکر سے-وہ ثابت کرتے ہیں جو اُس نے خود کے لیے ثابت کیا۔ ہماری عقلوں کے لیے بھی اس میں سے صرف وہی قبول کرنا ہے جو اُسی کی طرف لوٹتا ہے۔ پس وہی زندہ ہے ﴿جس کے سوا کوئی معبود نہیں المالک، القدوس، السلام، المومن، المہیمن، العزیز، الجبار اور المتکبر ہے۔﴾ ﴿غیب وشہادت کا جاننے والا ہے، الرحمٰن اور الرحیم ہے﴾ ﴿وہ الخالق، الباری، المصور اور الحکیم ہے﴾ (الحشر: ۲۲-۲۴) اس نے ہمیں اِن (صفات) اور ان جیسی (صفات) کا خود کو حامل بتایا ہے چنانچہ ہم ان سب (صفات) پر اس کے بتانے سے ایمان رکھتے ہیں، اپنی (عقلی) تاویل سے نہیں کیونکہ ﴿اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا دیکھنے والا ہے﴾ (الشوریٰ: ۱۱) اس لیے وہ عقل اور فکر کی قید میں نہیں آسکتا۔ یوں ہمارے پاس اثبات کے راستے سے اس (ذات) کا وہی علم ہے جو اس نے اپنی کتابوں میں یا اس کی ترجمانی کرنے والے اپنے رسولوں کی زبانی ہم تک پہنچایا، اِس کے علاوہ کچھ نہیں۔ ان اسماء کی اُس (ذات) سے نسبت ہمیں معلوم نہیں کیونکہ کسی معاملے میں نسبت کی معرفت، منسوب الیہ (جس کی طرف نسبت کی جارہی ہے) کے علم پر موقوف ہوتی ہے جبکہ ہمیں منسوب الیہ (یعنی اُس ذات پاک) کا کوئی علم نہیں لہٰذا ہمیں اس خاص نسبت کا بھی کچھ پتا نہیں۔ فکر، تفکر اور مفکر ٹھنڈے لوہے پر ضرب لگاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو ایسا بنا دے جو فہم رکھتے ہیں اور جب ان کی طرف اس پاک ذات سے کچھ آتا ہے یا لایا جاتا ہے تو اسی پر توقف کرتے ہیں۔ (ص ۱۹۹)

فاضل مترجم نے ترجمہ کرتے ہوئے کوشش کی ہے کہ متن کے قریب قریب رہیں اور ان کی یہ کوشش رائیگاں نہیں گئی۔ بعض مقامات پر البتہ متن اور ترجمہ میں دوری کا احساس ہوتا ہے، متن میں چند مقامات ایسے ہیں جن کے لفظی ترجمے سے شیخؒ کے مطالب کا ابلاغ ممکن نہیں تھا، اسی طرح کہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ترجمانی کا فریضہ انجام دیتے ہوئے شیخؒ کا مدّعا عیاں ہونے کے بجائے مستور ہوگیا ہے۔ بایں ہمہ ترجمہ

کرنے کی سعی لائق ستائش ہے اور محترم مترجم سے التماس ہے کہ وہ اپنی اس استعداد پر مزید توجہ دیں اور ہم توقع کرتے ہیں کہ شیخ کے مطالب کو بیان کرنے میں بہتری کی جانب اپنی جد و جہد جاری رکھیں گے۔

کتاب کو اچھے اہتمام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ آفسٹ بک پیپر استعمال کیا گیا ہے، سرورق کو دیدہ زیب بنایا گیا ہے۔ شروع میں فاضل مترجم نے ایک مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں شیخ اکبرؒ کی چند اصطلاحات کی توضیح کے علاوہ تصوف سے متعلق مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ کتاب کا اصل متن ۱۵۴ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں دائیں جانب عربی متن ہے اور بائیں طرف اردو ترجمہ۔ اس کے بعد عربی حواشی اور پھر اردو حواشی درج ہیں۔ شیخ اکبرؒ کے دست نوشت مخطوطے کا عکس بھی شامل کیا گیا ہے۔ آخر میں شیخ کے زیر نظر رسالے کے مخطوطات کے متعلق تفصیل درج ہے۔

——خضر یاسین

⁂

اسلامی اور مغربی تہذیب کی کشمکش (فکر اقبال کے تناظر میں)، ڈاکٹر محمد آصف، ناشر: بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی ملتان ۲۰۰۹ء۔ صفحات: ۵۷۵، قیمت: -/۵۰۰ روپے۔

زیر نظر کتاب کا عنوان معاصر علمی موضوعات میں سے ایک ہے۔ موضوع دلچسپ لیکن خاصا پیچیدہ ہے۔ ''فکر اقبال کے تناظر میں'' کے لاحقے نے موضوع کو محدود اور متعین کر دیا ہے۔ مصنف نے موضوع کو سمیٹنے کے لیے چار ابواب بنائے ہیں۔ پہلے باب میں ''تہذیب کی ماہیت'' کو تعلیمی (Academic) انداز سے زیر بحث لایا گیا ہے۔ دوسرے باب میں ''اسلام اور مغرب کے مابین روابط'' کی وضاحت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں ''اقبال کی شخصیت کے تہذیبی عوامل'' پر بحث کی گئی ہے۔ چوتھے اور آخری باب میں کتاب کے اصل موضوع کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ آخر میں اختتامیہ اور کتابیات کی فہرست دی گئی ہے۔

یہ کتاب پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے لکھا جانے والا مقالہ ہے۔ نفسِ موضوع کا تقاضا ہے کہ اسے ایک مخصوص Academic ماحول سے ہٹ کے ہونا چاہیے تھا لیکن بہرحال یہ بھی غنیمت ہے کہ مصنف نے ایک ایسے موضوع پر محنت کی ہے جو ہمارے موجودہ شعوری مزاج کے لیے بہت کم کشش کا باعث بنتا ہے۔ مصنف نے حوالہ جات سے اپنے موقف کو ثابت کرنے کی سعی کی ہے، بہتر ہوتا اگر وہ تہذیب یا حضارت کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر قائم کرتے۔ تہذیب کی تعریف میں ۱۵ حوالے نقل کیے ہیں مگر نتیجہ ایک دو سطروں میں انتہائی مبہم اور غیر واضح بیان کرنے پر قناعت کر لی ہے۔ علاوہ ازیں ''تہذیب'' کے معنی کو متعین کرنے میں متضاد

تصورات اکٹھے کر دیے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مصنف جب بھی یہ لفظ استعمال کرتے ہیں وہ ایک نئے مدلول کی جانب اشارہ کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

''اسلام اور مغرب کے مابین روابط'' کے عنوان کے تحت دوسرے باب میں تہذیبوں کے مابین تعلقات اور اسلام اور مغرب کے مابین روابط پر روشنی ڈالی ہے۔ اس باب میں مصنف نے لکھا ہے کہ ''مسلم تہذیب کے رونما ہونے کے بعد اسلام ایک عالمی نظام اور عالم گیر ریاست تو بن گیا لیکن عالمی تہذیب نہیں بن سکا'' اس کا مطلب یہ ہے کہ تہذیب اور ریاست ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم نہیں ہیں۔ اگر تہذیب کے مدلول کے بارے میں مصنف کا ذہن واضح ہوتا تو وہ یہ بات نہ لکھتے۔ اسلام نہ تو کبھی عالمی نظام رہا ہے اور نہ کبھی عالم گیر ریاست بنا ہے۔ تہذیب ہوا میں معلق شے ہونے کی بجائے عمرانی اقدار کے شعور سے عبارت ہے۔ اس لیے جغرافیائی حدود کے تناظر اور زمان ومکان کے ابعاد میں اپنا وجود برقرار رکھتی ہے۔

علامہؒ کے متعلق ابواب میں بڑی وضاحت وصراحت کے ساتھ بعض موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ مصنف نے اچھے اچھے نکات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب دلچسپ ہے اور معلومات کا خزانہ ہے۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ مصنف اپنی علمی کاوشوں کو جاری رکھیں گے۔

——خضر یاسین

⁂